رسول اللہ بحیثیت ایک مدبّر

___: محمود احمد غازی ___

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی سیرتِ طیبّہ کے کسی پہلو پر گفتگو کرتے وقت یہ بات فراموش نہ کرنی چاہیئے کہ حضور علیہ السلام کی سیرت تاریخِ انسانی کی جامع ترین اور کامل ترین شخصیّت کی سیرت ہے۔ یہ سیرت پوری دُنیا کے لئے واحد نمونہ ہدایت ہے جس میں ہر قسم کے انسانوں کے لئے ہدایت موجود ہے۔ دعوت و تبلیغ کا کام کرنے والوں کو صحیح اور مکمّل رہنمائی یہیں سے مل سکتی ہے۔ حکمرانوں اور فرمانرواؤں کے لئے سرکارِ مدینہ ہی کی سیرت نمونہ بن سکتی ہے۔ کوئی کسی بیوی کا شوہر ہو تو اس کو چاہیئے کہ امہات المومنین کے پاکباز شوہر سے ہدایت حاصل کرے۔ کوئی صاحبِ اولاد ہو تو اس کو صرف فاطمہ، رقیہ اور ابراہیم کے والد اور حسن و حسین اور امامہ کے نانا کی زندگی سے رہنمائی مل سکتی ہے۔ ایک معلّم اور مدرس کو چاہیئے کہ وہ دارارقم اور صفہ کے معلّم سے سبق حاصل کرے، سپہ سالاروں اور صاحبانِ سیف و سناں کو اگر کہیں سے کوئی نمونہ ہدایت مل سکتا ہے تو صرف سالارِ بدر و حنین کے ہاں سے مل سکتا ہے۔ ایک فاتح جرنیل کی کیا شان ہونی چاہیئے۔ یہ صرف فاتح مکّہ کے ہاں دیکھا جاسکتا ہے۔ ایک مدبر اور سیاست دان کے لئے کیا اُسوۂ حسنہ ہونا چاہیئے۔ یہ اُس کو صرف صُلح نامہ حدیبیہ کی شرائط پر گفتگو کرنے والے مدّبر اور میثاقِ مدینہ مرتّب کرنے والے سیاست دان کے ہاں سے معلوم ہوسکتا ہے۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسّلام کا مدبر اور سیاست دان ہونا آپؐ کی زندگی کے بے شمار پہلوؤں میں سے محض ایک ادنیٰ پہلو ہے۔ اس پر گفتگو کرتے وقت حضورؐ کی اصل اور برتر حیثیت نظروں سے اوجھل نہ ہونی چاہیئے۔ آپؐ کی اصل حیثیت بہرحال ایک نبی مُرسل اور فرستادۂ خداوندی ہے جو روزِ قیامت تک عالمِ انسانیت کے سامنے اللہ ربّ العزّت

خالق کائنات کا واحد نمائندہ مجاز اور ترجمان مرضی الٰہی ہے، جس کا اصل وظیفہ تلاوتِ آیات، تزکیۂ نفس اور تعلیم کتاب و حکمت ہے۔ باقی سارے وظائف اور پہلو اسی اصل الاصول کے لوازم و فروع ہیں۔ حضور علیہ السّلام نے اپنی زندگی میں جو کچھ بھی کیا اور جس پہلو سے بھی کیا اس میں اصل اور بنیادی حیثیت ایک نبی اور رسول ہی کی تھی اور یہی فرائضِ نبوّت آپؐ کے پیشِ نظر تھے۔

ایک مدبّر کی حیثیت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی سیرتِ طیبّہ پر نظر ڈالنے سے قبل بہتر ہوگا کہ ایک نظر اس عظیم مقصد پر بھی ڈال لی جائے جس کا حصول آپؐ کے پیشِ نظر تھا اور جس کو حاصل کرنے کے لئے آپ نے اپنی ساری عمر کھپائی اور نہایت اعلیٰ بصیرت اور کمال تدبّر کے ساتھ اس مہم کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ ایک نبی کی حیثیت سے حضورؐ کا کام یہ تھا کہ اوّل لوگوں تک خدا کی ہدایت اور دینِ حق کی دعوت پہنچائیں، جو لوگ آپؐ کی اس دعوت کو قبول کرکے دائرۂ اسلام میں داخل ہوتے جائیں ان کے ذریعہ ایک امتِ مُسلمہ کی تشکیل ہو، یہ امتِ مُسلمہ زمین پر اللہ کی حجّت و برہان قرار پائے، اس کے جملہ انفرادی اور اجتماعی نظامات اسلام کی بنیادوں پر قائم ہوں، اس کے تمدّن کی اساس قرآن و سنّت پر ہو، یہ امّت دُنیا میں عدل و انصاف کی علمبردار ہو اور زبانِ حال اور زبانِ قال سے شہادتِ حق کا عظیم الشّان فریضہ سرانجام دے، حق و باطل کا معیار وہی اصول قرار پائیں جن پہ اس امت کی اساس ہو، اقوامِ عالم کی فکری اور تہذیبی رہنمائی کا منصب اس امّت کا حاصل ہو، یہ امّت اپنے اصولوں پر دُنیا بھر کی اصلاح کے لئے کوشش کرے اور دُنیا کے انسانوں تک دینِ حق کی دعوت کو پہنچائے، حق و باطل کے فرق کو واضح کرنے کی کوشش کرے اور اس طرح دُنیا میں اللہ کی حُجّت تمام ہو جائے لیھلك من ھلك عن بینۃ۔ ویحیٰ من حیّ عن بینۃ۔ جو ہلاکت میں پڑنا چاہے وہ (سوچ سمجھ کر) دلیل کے ذریعہ ہلاک ہو اور جو (ہدایت کے مطابق) زندہ رہنا چاہے وہ بھی (علیٰ وجہ البصیرت) دلیل کے مطابق زندہ رہے۔

یہ تھا وہ عظیم الشّان مقصد اور مشن جس کے حصول کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے تیئس سال کی جاں گسل جدوجہد کی، دُنیا بھر کی باطل قوتّوں سے پنجہ آزمائی کی اور ہر طرح کی تکالیف کو برداشت کیا۔ اسی مقصد کے حصول کے لئے حضورؐ نے اپنی ساری صلاحیتیں کھپا ڈالیں۔ فاقے جھیلے تو اسی لئے۔ تلوار اُٹھائی تو اسی مقصد سے، سیاسی گفت و شنید کی تو اسی غرض سے،

گھر بار چھوڑا تو اسی مقصد کے پیش نظر تھی کہ اکثر و بیشتر شادیاں بھی اسی جذبہ سے کیں۔

اس مہم میں حضور علیہ السلام نے اپنے مخالفین سے کس طرح مقابلہ کیا، کس حکمت عملی سے یہ عظیم کارسرانجام دیا اور کس کامیابی سے مختلف سیاسی تدبیریں استعمال فرمائیں۔ یہ صرف سیرتِ نبوی کا ایک بہت دلچسپ حصہ ہے بلکہ اس میں آج کے مدبرین اور سیاست کاروں کے لئے بھی رہنمائی موجود ہے۔

چونکہ حضور علیہ السلام رحمۃ للعالمین اور محسنِ انسانیت بلکہ محسن اعداء تھے۔ اسی لئے آپؐ کی پالیسی کا بنیادی جزو یہ تھا کہ مخالفین کو نیست و نابود کرنے کے بجائے ان کو سیاسی اعتبار سے بے اثر اور فوجی اعتبار سے بے دست و پا کر دیا جائے اور ان کے سیاسی زور اور عسکری قوت کو صرف اس حد تک توڑ دینے پر اکتفا کیا جائے کہ وہ نظامِ اسلام اور حکومتِ اسلام کیلئے کسی درجہ میں بھی خطرہ نہ بن سکیں تاکہ دینِ حق کو ایسی حیثیت حاصل ہو جائے کہ ادیانِ باطلہ نہ تو اس کو شکست دے سکیں نہ اپنے سامنے جھکا سکیں۔ اس ضمن میں آپؐ کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ دشمنانِ اسلام پر اسلام اور اسلامی حکومت کا رعب اور دبدبہ قائم کر دیا جائے۔ خود قرآن مجید میں بھی کفار پر رعب اور دبدبہ کے قیام کو اسلامی حکومت کی عسکری پالیسی کا مقصد بتایا گیا ہے۔ سورۂ انفال کی آیت ہے، واعدوا لھم ما استطعتم من قوۃ ومن رباط الخیل ترھبون بہ عدو اللہ و عدوکم و آخرین من دونھم لا تعلمونھم اللہ یعلمھم۔ (اور ان لوگوں کے مقابلہ کے لئے جس قدر قوت اور فوجی سازوسامان (گھوڑے وغیرہ) تم سے ممکن ہو سکے تیار کر رکھو، تاکہ تم اس کے ذریعہ اللہ کے دشمنوں کو اور ایسے دوسرے بہت سے لوگوں کو جن کو تم نہیں جانتے اور جن کو اللہ خوب جانتا ہے ڈرا کر رکھ سکو) اللہ تعالیٰ نے رسولِ کریم صلعم کو بھی کفار پر خصوصی رعب اور دبدبہ عطا فرمایا تھا۔ حدیث میں آتا ہے کہ آپؐ نے فرمایا نصرت بالرعب مسیرۃ شھر یعنی ایک ماہ کی مسافت ہی سے دشمن کے دل میں میرا رعب بیٹھ جاتا ہے اور یہ صرف میرے لئے خصوصی نصرتِ الٰہی ہے۔

اس ضمن میں حضور علیہ السلام کا طریقۂ کار اور مخالفینِ اسلام کے ساتھ آپؐ کا رویّہ ایک فاتح کے بجائے ایک داعی اور مشنری کا تھا۔ آپؐ کی تمام جنگوں اور مدبرانہ اقدامات میں ایک

جنگجو کمانڈر کے بجائے ایک معلّم کی رحمدلانہ شان پائی جاتی ہے۔ یہ آپؐ کی داعیانہ رحمدلی اور معلّمانہ شفقت ہی تھی کہ ابوجہل جیسے "الدّ اعداءِ اسلام" کے لئے بھی آپؐ آخر وقت تک قبولِ اسلام کی دُعا کرتے رہے۔ دوسری طرف اس داعیانہ شان کے اثرات وثمرات بھی دیکھئے کہ دشمنانِ اسلام کی صفِ اوّل سے ایک شخص نکلا اور اسلامی کیمپ میں آکر فاروقِ اعظمؓ کے جلیل القدر مرتبہ پر فائز ہوگیا۔

دشمن کو سیاسی طور پر بے اثر کردینے کی یہ پالیسی خاص طور پر مدنی زندگی میں جگہ جگہ اور قدم قدم پر کارفرما نظر آتی ہے۔ آپؐ نے جس قدر بھی عملی خطوط مرتّب کئے وہ سب اسی پالیسی کے ماتحت تھے۔ مدینہ میں دفاعی قوّت کی تنظیم وتشکیل اسی بنیاد پر ہوئی۔ مکّہ والوں کی تجارتی اور معاشی ناکہ بندی کا مقصد بھی یہی تھا کہ ان لوگوں کے زور کو اس حد تک ختم کردیا جائے کہ وہ مسلمانوں کو کڑی نگاہ سے نہ دیکھ سکیں، مختلف قبائل عرب سے جنگ نہ کرنے کے باہمی معاہدے کئے گئے، فتحِ مکّہ کے بعد طائف کا محاصرہ بھی اسی غرض سے اُٹھا لیا گیا کہ اب یہ لوگ بہرحال نہ تو اس قدر زور آور ہوسکتے ہیں کہ اسلام کے لئے کوئی بڑا خطرہ پیدا کرسکیں اور نہ اسلام کی ہمہ گیر رَو سے زیادہ دیر الگ رہ سکتے ہیں۔ اس طرح غزوۂ تبوک کے موقع پر جب قیصرِ روم نے از خود حملہ نہ کیا اور واپس ہوگیا تو آپؐ نے بھی پیش قدمی سے احتراز کیا اور تبوک کے آس پاس بسنے والے قبائل سے مختلف معاہدے کرکے واپس چلے آئے۔ فتحِ مکّہ کے موقع پر آپؐ نے سختی سے اس کی ممانعت فرمائی کہ مسلمان فوجیں از خود کسی پر ہتھیار نہ اُٹھائیں اور حتی الامکان اس امر کی کوشش کریں کہ پُر امن طور پر مکّہ میں داخل ہوجائیں۔ اس ضمن میں حضور صلعم کے تاکیدی احکامات کا یہ عالم تھا کہ جب اسلامی لشکر کے ایک ذمّہ دار افسر نے یہ نعرہ لگایا "آج معرکہ کا دن ہے اور آج کعبہ کی حرمت کو حلال کیا جائے گا" تو آپؐ نے فوراً ان کے ہاتھ سے کمان اور جھنڈا لے کر اُن کے بیٹے کے سپرد کردیا۔ یہ سب واقعات اُسی پالیسی کے مظہر ہیں۔

ہجرت کے بعد مدینہ تشریف آوری کے دو سال کے اندر اندر حضور علیہ السلام نے مدینہ کے آس پاس قیام پذیر قبائل سے بہت سے سیاسی معاہدے کئے۔ کچھ قبائل سے باقاعدہ دفاعی معاہدے بھی عمل میں آئے جن میں طے پایا کہ مسلمان اور وہ قبائل بیرونی

حملوں کی صورت میں ایک دوسرے کا ساتھ دیں گے۔ بعض قبائل کے ساتھ صرف اتنی بات پر سمجھوتہ ہوا کہ وہ اعدائے اسلام کے ساتھ کسی نوعیّت کا تعلّق نہ رکھیں گے، کچھ قبائل سے یہ بھی طے پایا کہ اگر مسلمانوں پر کسی طرف سے حملہ ہوا تو وہ غیر جانبدار رہیں گے۔ بعد میں بھی آپؐ کی یہ ایک مستقل پالیسی رہی کہ حلیفانہ تعلقات کو زیادہ سے زیادہ توسیع دی جائے۔ چنانچہ غزوۂ تبوک کے موقع پر جب قیصرِ روم واپس ہوگیا اور مسلّح معرکہ آرائی کی نوبت نہ آئی تو آپؐ نے تقریباً ایک ماہ اس علاقہ میں قیام فرمایا اور متعدّد مقامی قبائل سے مختلف قسم کے معاہدے کئے۔

حلیفانہ تعلقات کی اس توسیع اور مختلف قبائلِ عرب سے کئے جانے والے ان معاہدوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ نہ صرف مدینہ کی اسلامی ریاست کو سارے عرب میں ایک مرکزیّت حاصل ہوگئی بلکہ وہ عرب کی سیاست کا مرکزِ ثقل بن گئی اور کسی مخالف قوّت کے لئے یہ ممکن نہ رہا کہ وہ مسلمانوں کو لقمۂ تر سمجھ کر آسانی سے ہضم کرلے۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسّلام کی اس پالیسی کا نتیجہ یہ نکلا کہ چند سال کے نہایت قلیل عرصہ میں آپؐ نے اپنا عظیم الشّان مشن نہایت کامیابی سے پایۂ تکمیل تک پہنچا دیا۔ حضورؐ کا برپا کردہ انقلاب تاریخِ انسانی کا نہ صرف کامیاب ترین اور مکمّل ترین انقلاب ہے بلکہ یہ تاریخِ انسانی کا سب سے زیادہ پُرامن انقلاب بھی ہے۔ ایک طرف اس انقلاب کی جامعیت اور ہمہ گیری کو دیکھئے، دوسری طرف ان مخالفتوں اور مزاحمتوں کو پیشِ نظر رکھیں جن کا حضورؐ کو سامنا کرنا پڑا، پھر ۲۳ برس کی قلیل مدّت! ان باتوں کے علاوہ کم سے کم اِنسانی خون کی قربانی! اس کو صرف معجزۂ نبوّی ہی کہا جاسکتا ہے۔ فرانس کے نام نہاد، ناقص اور ہڑبونگ سے بھرپور انقلاب کو دیکھئے، کتنے بے گناہ اِنسانوں کی جانیں ضائع ہوئیں، کتنوں کی جائدادیں لُٹیں اور برس ہا برس افراتفری اور فوضویت کی نذر ہو گئے اور نسلِ آدم کو بحیثیتِ مجموعی حاصل کیا ہوا؟ یہی بلکہ اس سے بھی بدتر حال موجودہ صدی کے اشتراکی انقلاب کا ہے۔

دوسری طرف محمدی انقلاب کا جائزہ لیجئے، جس نے انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ہر ہر پہلو کو بدل دیا، خیر و شر کے معیار بدل دیئے، تہذیب و تمدّن کی اقدار بدل ڈالیں، معاشرت

ومعیشت کے نئے نظام قائم کر دیئے اور وہ سب کچھ کر دیا جو ایک ہمہ گیر اور مکمل انقلاب کے لئے ضروری ہے۔ مکّہ میں حضور علیہ السّلام نے تیرہ سال تک سخت جاں گسل حالات میں اسلام کی تبلیغ کی، جب آپؐ نے ہجرت فرمائی تو مسلمانوں کی کُل تعداد تقریباً ساڑھے چھ سو تھی۔ مدینہ میں تقریباً دو سو، مکّہ میں چار سو تیس پینتیس کے لگ بھگ اور حبشہ میں کچھ اوپر سو مسلمان تھے۔ ہجرت کے بعد پہلی عید کے موقع پہ ۲ ھ میں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے مدینہ میں مردم شماری کرائی تو سات سو کے قریب مرد تھے، اتنی ہی عورتیں فرض کر لی جائیں تو ۲ ھ میں دُنیا بھر میں کُل مسلمان زیادہ سے زیادہ دو ہزار بنتے ہیں۔ یہ تھی وہ افرادی قوّت جس کو ساتھ لے کر حضورؐ نے کام شروع کیا۔ قیامِ مدینہ کے دَوران حضورؐ نے کُل سترہ غزوات میں حصّہ لیا، ۳۲ سرایا بھیجے، تقریباً گشتی دستے وقتاً فوقتاً ارسال فرمائے، دو سو نو وفود کو بار یاب فرمایا، مختلف قبائل عرب سے معاہدے کئے (جن کی تعداد شاید ۲۵ - ۳۰ بنتی ہے) سو کے قریب تبلیغی و سیاسی سفراء بھیجے۔ بے شمار تبلیغی و سیاسی خطوط لکھے جن میں تقریباً چار سو خطوط کے متن تو اب تک دستیاب ہیں۔ اس کے علاوہ تقریباً تین سو قبائلی سرداروں سے بیعت لی۔

ان سب سیاسی و عسکری اقدامات کا نتیجہ یہ نکلا کہ جب آپؐ حجتہ الوداع کے لئے تشریف لے گئے تو ڈیڑھ لاکھ کے لگ بھگ فرزندانِ اسلام ہمرکاب تھے۔ وفاتِ طیبّہ جب ہوئی تو ساڑھے نو لاکھ مربع میل رقبہ پر اسلامی حکومت کا پرچم لہرا رہا تھا اور قریب قریب دس لاکھ افراد اسلام قبول کر چکے تھے۔ لیکن اس پوری مہم میں کتنی انسانی جانوں کی قربانی دی گئی۔ یہ بات بڑی حیرت اور نہایت دلچسپی کا باعث ہو گی کہ اس ساری مہم میں صرف چودہ سو افراد کا خون بہا۔ سارے غزوات اور جنگوں میں چار سو سے کچھ کم ہی صحابہؓ نے جامِ شہادت نوش کیا اور نو سو سے کچھ زائد کافر مارے گئے۔

یُوں تو ہمارا ایمان و ایقان ہے کہ یہ عظیم الشّان کامیابی صرف اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائی۔ اگر اس کی نصرت اور اس کا فضل شاملِ حال نہ ہوتا تو ہرگز ہرگز یہ کامیابی حاصل نہ ہو سکتی تھی، لیکن یہ کام اس نے بہر حال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم سے لیا اور آپؐ کو

وہ ساری صفات، صلاحیتیں اور خوبیاں عطا فرمائیں جن سے حضورؐ نے اس مہم میں کام لیا۔

اس ضمن میں سب سے پہلی چیز حضور علیہ الصلوٰۃ والسّلام کا وہ برتر اخلاق اور وہ زبردست اخلاقی رُعب ہے جو مخالفین کو جُھکنے پر مجبور کر دیتا تھا۔ یہ ایک سیاسی مدبّر کے تدبّر کی کامیابی کا انتہائی کمال ہے کہ وہ اپنے مخالفین کے دلوں کو اپنے حسنِ اخلاق سے مسخر کرلے۔ حضورؐ کی زندگی میں بارہا ایسے مواقع پیش آئے جب آپؐ کے مخالفین نے آپؐ کے اخلاقی رعب کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے۔ قیامِ مکّہ میں جس زمانہ میں کفّار کی طرف سے ظلم و تشدّد اپنی انتہا پر تھا انہی دنوں ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کعبہ میں نماز پڑھ رہے تھے، قریب ہی کفّار کی ایک ٹولی خوش گپیوں میں مصروف تھی۔ نشانۂ تمسخر ایک ایسا شخص تھا جس کی کچھ رقم ابوجہل کے ذمّہ واجب الادا تھی۔ کسی شخص نے یونہی بر سبیلِ تمسخر قرض خواہ سے کہہ دیا کہ تمہارا قرض یہ صاحب دلا دیں گے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی طرف اشارہ کیا۔ وہ شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی خدمت میں حاضر ہوا اور مدّعا عرض کیا۔ حضورؐ نے ذرّہ برابر تامّل نہ فرمایا اور اس شخص کو لے کر ابوجہل کے گھر کی طرف چلے۔ یہ ساری ٹولی بھی تماشا دیکھنے کی غرض سے پیچھے پیچھے ہولی۔ حضورؐ ابوجہل کے گھر پہنچے اور آواز دی۔ ابوجہل باہر نکلا اور آپؐ کو موجود پا کر حیران رہ گیا۔ آپؐ نے فرمایا اس شخص کا قرض ادا کر دو۔ ابوجہل اس قدر مبہوت اور مرعوب ہوا کہ ذرا تامّل نہ کر سکا اور فوراً اس شخص کا قرض اس کو ادا کر دیا۔

کفّار پر حضور صلی اللہ علیہ وسلّم کے اخلاقی رُعب کی اس سے بڑھ کر اور کیا مثال ہو گی کہ جب وہ اجتماعی طور پر آپؐ کو قتل کرنے کے ارادہ سے آئے اُس وقت بھی ان کی امانتیں آپؐ کے پاس اسی گھر میں موجود تھیں جس کا وہ محاصرہ کئے کھڑے تھے۔ ناممکن تھا کہ وہ کفّار جو دل سے حضورؐ کی دیانت و امانت کے قائل اور اپنے عمل سے اس کے گواہ تھے سیاسی طور پر حضورؐ کے سامنے ٹھہر سکتے اور آپؐ کے مقابلہ میں کسی قسم کی کامیابی حاصل کر سکتے۔

دوسری بڑی صفت جو ایک قائد یا مدبّر میں ہونی چاہیئے وہ یہ ہے کہ وہ جس رویّہ اور جس قربانی کا دوسروں سے مطالبہ کرتا ہو خود اس پر اَوروں سے بڑھ کر عمل کرتا ہو۔ ایسا قائد

جو خود اپنے کئے پر عمل نہ کرتا ہو ناممکن ہے کہ وہ زیادہ عرصہ تک اپنے پیروکاروں کو اپنی قیادت میں متحد رکھ سکے یا اپنے مقصد کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے۔ اس ضمن میں اگر دُنیا کے کسی اِنسان کو ایک مکمّل مثال یا نمونہ کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے تو صرف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کو پیش کیا جاسکتا ہے۔ آپؐ اگر اپنے پیروؤں کو پانچ وقت نماز پڑھنے کا حکم دیتے ہیں تو خود چھ وقت کی نماز ادا کرتے ہیں، جس قربانی کا آپ عام مسلمانوں سے مطالبہ کرتے ہیں خود اس سے کہیں بڑھ چڑھ کر قربانیاں پیش کرتے ہیں مسجد کی تعمیر ہو یا خندق کی کھُدائی اللہ کا رسول ہر موقع پر عام مزدوروں کے ساتھ مل کر کام کرتا ہے۔ ایک موقع پر جب ایک صحابی بھُوک کی شدّت کی شکایت حضورؐ سے کرتے ہیں اور قمیص کا دامن اُٹھا کر دکھاتے ہیں کہ ایک پتھر پیٹ پر باندھ رکھا ہے تو جواب میں اللہ کا رسوؐل مُسکرا کر اپنی قمیص کا دامن اٹھا کر دکھاتا ہے اور لوگ دیکھتے ہیں کہ اس نے ایک کے بجائے دو پتھر پیٹ پر باندھے ہوئے ہیں۔

۸ھ میں فتحِ مکّہ کے بعد جب مسلمانوں نے ثقیف والوں کے خلاف فوجی کارروائی کی اور ان کے چھ ہزار قیدیوں کو مسلمانوں میں حسبِ دستور تقسیم کر دیا گیا تو ان کے اہلِ قبیلہ کے ایک وفد نے آکر حضورؐ سے رہائی کی درخواست کی۔ عربوں کے لئے یہ ایک بڑی انوکھی بات تھی کہ دشمن کے قیدی بغیر کسی فدیہ کے رہا کر دیئے جائیں۔ ممکن تھا کچھ لوگ تأمل کرتے لیکن آپؐ نے فرمایا کہ مجھ کو بنی ہاشم کے حصّہ کے قیدیوں پر اختیار ہے وہ تو میں رہا کرتا ہوں اور دوسروں کے لئے سفارش کرتا ہوں۔ یہ سُننا تھا کہ سب مسلمانوں نے اپنے اپنے حصّہ کے قیدی رہا کر دیئے۔

تیسری بڑی صفت جو کسی قائد میں ہونا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ اس کو نہ صرف اپنی مہم کی کامیابی اور حقانیت کا کامل یقین ہو بلکہ اس کی چشمِ بصیرت بھی اس قدر تیز اور دُور رس ہونی چاہیئے جو اس کو اس کی چشمِ بصارت سے ان تمام مراحل و ادوار کا مشاہدہ کرادے جو اس کی تحریک کو مختلف زمانوں میں پیش آنے والے ہیں جب تک کسی قائد کو یہ چیز میسّر نہ ہو وہ اپنی تحریک کو کامیاب نہیں بنا سکتا۔ دنیا کے عام سیاسی قائدین بھی اپنے سیاسی مطمحِ نظر اور منزلِ مقصود کے مختلف مدارج و مراحل کا کسی نہ کسی حد تک

شعور رکھتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم تو اللہ کے سچّے نبی تھے، آپؐ تو اللہ رب العزّت کے حکم سے اپنے مشن کو لے کر کھڑے ہُوئے تھے، آپؐ کو تو جیسا کچھ یقین و اذعان اپنے مشن کی کامیابی اور جس قدر بھی کامل شعور اس کے مختلف مدارج و مراحل کا ہوگا ظاہر ہے۔ پھر مدنی زندگی میں تو اس یقین و شعور کا پایا جانا کچھ زیادہ اہمیت نہیں رکھتا کہ وہاں تو آپؐ کا مشن کامیابی کے مرحلہ میں قدم رکھ ہی چکا تھا، غور کرنے کے قابل بات تو یہ ہے کہ مکّہ مکرّمہ کے ابتدائی دَور میں جب جان نثاروں کی تعداد چند نفوس سے زائد نہ تھی اور ظلم و تشدّد کی کوئی قسم ایسی نہ تھی جو انسانوں کے دماغ میں آسکتی ہو اور عمل میں نہ آئی ہو، بظاہر سارے اسباب ختم ہو چکے تھے اور کوئی صورت تحریک کو آگے بڑھانے کی ممکن نظر نہ آتی تھی اس وقت بھی حضور صلعم بچشم سر ان تمام مدارج و مراحل اور ان تمام کامیابیوں کا مشاہدہ فرمارہے تھے جہاں تک تحریک کو ایک نہ ایک دن پہنچنا تھا۔

مکّہ کے ابتدائی دَور میں ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کا ارادہ ہوا کہ کعبہ میں نماز ادا فرمائیں، آپؐ نے کلید بردارِ کعبہ عثمان بن طلحہ سے کعبہ کا دروازہ کھولنے کی فرمائش کی، عثمان نے نہایت سختی و ترشروئی سے انکار کر دیا۔ آپؐ نے فرمایا عنقریب یہ کُنجی ہمارے ہاتھ میں ہوگی اور ہم جسے چاہیں گے دیں گے۔ اور فی الواقع فتحِ مکّہ کے موقع پر یہ کُنجی حضورؐ کے تصرّف میں آئی اور قربان جائیے رحمۃ للعالمین کی شان عفو و رحمت کے کہ آپؐ نے یہ کُنجی قیامت تک کے لئے انہی عثمان بن طلحہ اور ان کی اولاد کو مرحمت فرمائی اور آج تک اسی خاندان کے ہاتھ میں ہے۔ ایک دوسرے موقع پر جب بعض مسلمانوں نے کفّار کے ظلم و تشدّد کی شکایت کی تو آپؐ نے اُن کو تسلّی دیتے ہوئے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ضرور اس مہم کو کامیاب فرمائے گا اور ایک ایسا نظامِ عدل و رحمت اور نظامِ امن و عافیت قائم ہو جائے گا کہ ایک سوار صنعاء سے حضر موت تک کا سفر کرے گا اور اس کو اللہ کے سوا کسی کا خوف نہ ہوگا۔
سفرِ ہجرت میں جب عرب کا مشہور کھوجی سراقہ بن جعشم حضورؐ کا پیچھا کرنے نکلتا ہے اور کئی بار ٹھوکر کھانے کے بعد معافی مانگ لیتا ہے تو حضورؐ اُس کو امان عطا فرماتے ہوئے کہتے ہیں سراقہ میں تمہارے ہاتھوں میں کسریٰ کے کنگن دیکھ رہا ہوں۔ اور یہ بات تو آپؐ نے

مشرکین سے دورانِ تبلیغ کئی بار کہی کہ اگر تم میرے اس پیغام کو قبول کر لو تو اس کے ذریعے تم کو سارے عرب پر بادشاہت حاصل ہو جائے گی اور دنیا بھر کی قیادت تم کو مل جائے گی۔

ایک مدبّر کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ اس کو نہ صرف اپنی ذات پر بلکہ اپنے پیروؤں پر بھی مکمل اعتماد ہو، اسی طرح پیروؤں کو بھی اپنے قائد پر کامل اعتماد اور اس کی دیانت و بصیرت پر پورا وثوق ہو۔ اس معاملہ میں تو دنیا کے کسی انسان کی مثال اس سیاق و سباق میں دی ہی نہیں جا سکتی حضور صلی اللہ علیہ وسلّم اللہ کے رسول تھے، ان جیسا وثوق و اعتماد کون پیدا کر سکتا ہے۔ اپنی ذات اور اپنے مشن پر کامل وثوق و اعتماد کی اس سے بڑھ کر اور کیا مثال ہو گی کہ جب کفارِ مکّہ نے وفد بنا کر آپ کے چچا ابو طالب سے درخواست کی کہ آپ اپنے بھتیجے کی اعانت و حمایت سے دست کش ہو جائیں اور ابو طالب نے بھی حضورؐ کی طرف کچھ اس انداز سے دیکھا کہ بھتیجے مشکلات کا احساس کرو۔ تو آپؐ نے وہ مشہور تاریخی جواب دیا تھا کہ چچا اگر یہ لوگ میرے داہنے ہاتھ پر آفتاب اور بائیں ہاتھ پر ماہتاب بھی لا کر رکھ دیں تو بھی میں اس کام سے رکنے والا نہیں۔ یہاں تک کہ یا تو اللہ اس کام کو غالب کر دے یا میں اس میں اپنی جان کھپا دوں۔ قائد کی طرف سے اپنے پیروؤں پر اعتماد کی مثال کے طور پر وہ بے شمار احادیث کافی ہیں جن میں آپؐ نے اپنے صحابہ کی اجتماعی اور انفرادی طور پر تعریف وتحسین فرمائی ہے۔ صحابہ کے بعد اپنی امّت پر آپؐ نے فخر کا اظہار فرمایا ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ میری اُمّت میں ہمیشہ ایسے لوگ رہیں گے جو اس کام کو لے کر آگے بڑھتے رہیں گے۔

رہا قائد پر پیروؤں کا اعتماد تو یہ اس قدر ظاہر و باہر اور بدیہی حقیقت ہے کہ اس میں تو کسی قسم کے کلام کی گنجائش ہو ہی نہیں سکتی۔ صحابہ کو حضور علیہ السّلام کی سیاسی بصیرت اور تدبّر پر کس قدر اعتماد تھا، یہ ہم کو حدیبیہ کے موقع پر صاف نظر آتا ہے کسی شخص کی سمجھ میں نہیں آ رہا کہ صلح کی جو شرائط طے پا رہی ہیں ان میں اہلِ اسلام کے لئے کیا مصلحت ہے، شرائط بظاہر مایوس کن اور توہین آمیز ہیں لیکن صرف قائد پر اعتماد ہے جس کی وجہ سے سب نے سرِ تسلیم خم کر دیا ہے۔ اور پھر ظاہر بات ہے کہ اگر مسلمانوں کو خدانخواستہ رسولِ کریم صلعم

کی اخلاقی برتری اور اعلیٰ سیاسی بصیرت پر پورا پورا اور غیر متزلزل اعتماد نہ ہو تو پھر جیسا کچھ ایمان باقی رہ سکتا ہے واضح ہے لیکن اس کے باوجود خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم بھی اس امر کا التزام فرماتے تھے کہ "مواقع ظن" سے خود بھی احتراز فرمائیں اور دوسروں کو بھی اس کی تلقین کریں۔ آپؐ نے کبھی بھی اس بات کا موقع فراہم نہیں ہونے دیا جس سے کسی کمزور ایمان والے شخص کو ذراسی بدگمانی کا خدشہ ہو سکے۔ ایک بار رات گئے حضورؐ کہیں سے واپس آ رہے تھے، ام المومنین حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا بھی ہمراہ تھیں جس گلی سے آپؐ گزر رہے تھے اس کے اوپر والی دوسری گلی سے ایک انصاری صحابی گزرے وہ آپؐ کو دیکھ کر ذرا ٹھٹکے اور پھر چل دیئے۔ آپؐ نے فوراً اُن کو آواز دی اور ٹھہرا کر فرمایا انما ھی صفیۃ بنت حیی کہ میرے ہمراہ یہ صفیہ بنت حیی ہیں (کوئی غیر خاتون نہیں ہیں) اُن صحابی نے گڑگڑا عرض کیا یارسول اللہ میں تو یونہی ٹھٹک گیا تھا، خدانخواستہ میرے ذہن میں کوئی اور خیال نہ تھا۔ آپؐ نے فرمایا فان الشیطٰن یجری من الانسان مجری الدم (نہیں شیطان انسان کے بدن میں خون کی طرح گردش کرتا ہے) اور کوئی بھی وسوسہ یا بدگمانی پیدا کر سکتا ہے۔

ایک سیاسی قائد اگر اس کا کوئی نظریہ اور اصول ہے تو اسی وقت کامیاب ہو سکتا ہے جب وہ مضبوطی سے اپنے اصولوں پر قائم رہے اور وقتی مصالح کے پیشِ نظر اصولوں سے مُنہ نہ موڑے۔ ورنہ اس کی کامیابی اوّل تو ممکن نہیں اور اگر بالفرض عارضی طور پر اس کو کامیابی حاصل بھی ہو جائے تو وہ اس کے اصول اور نظریہ کی کامیابی نہ ہو گی، اس کی ذات کی ہو گی، اور ظاہر ہے کہ دیرپا اور دُوررس کامیابی وہی ہوتی ہے جو کسی اصول اور نظریہ کی بنیاد پر ہو۔ بے اصولی کامیابی تو بس خوش درخشید ولے شعلۂ مستعجل بود کا مصداق ہو کر رہ جاتی ہے۔ اس معاملہ میں اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی زندگی کو دیکھا جائے تو کون ہے جو اس معیار پر ٹھہر سکے جو معیار آپؐ نے قائم فرمایا اور آپؐ کے جانشینوں نے اس کو قائم رکھا۔ اصولوں پر قائم رہنے کی مثالیں نہ صرف سیرتِ نبویؐ سے بلکہ پوری تاریخِ اسلام سے اس قدر مل سکتی ہیں کہ بایدوشاید یہی بات تو تاریخ میں مسلمان قوم کا امتیاز رہی ہے۔

مکّہ میں ظلم وتشدّد کے دَور میں جب حضور علیہ السّلام مختلف قبائل عرب کے سامنے اسلام کو پیش فرما رہے تھے اور ان سے یہ اپیل فرما رہے تھے کہ وہ آپؐ کو اپنی حفاظت میں لے کر تبلیغِ اسلام کا موقع بہم پہنچائیں۔ اس موقع پہ ایک قبائلی سردار سے آپؐ کی ملاقات ہوئی جس نے آپؐ کی دعوت کو سُن کر قبولِ اسلام اور آپؐ کی نصرت وحمایت کرنے کا ارادہ ظاہر کیا لیکن شرط یہ رکھی کہ آپؐ کے بعد جانشینی اور اختیار اس کو یا اس کے اہلِ قبیلہ کو حاصل ہو۔ ظاہر ہے یہ بات آئندہ آنے والے اسلامی احکام اور روح دین سے صراحتاً متصادم تھی اور منشائے الٰہی بھی یہ نہ تھا کہ نبی کی جانشینی کا مسئلہ خود نبی طے کردے۔ اس لئے آپؐ نے مذکورہ شخص کی اس پیش کش کو ردّ فرماتے ہوئے کہا کہ یہ معاملہ تو اللہ کی مرضی پر منحصر ہے وہ جس کو چاہے گا حکومت واختیار سے سرفراز فرمادے گا۔

بعد کے زمانہ کی بات ہے۔ بنی مخزوم کی ایک معزز عورت فاطمہ بنت اسد نے چوری کی۔ مقدّمہ دربارِ رسالت میں پیش ہوا۔ لوگوں کو خدشہ ہوا کہ اب اس کے قطعِ ید کا حکم صادر ہوگا۔ عورت کے اہلِ قبیلہ نے طے کیا کہ اس معاملہ میں حضرت اسامہ ابن زید رضی اللہ عنہٗ سے سفارش کرائی جائے جو حضورؐ کو نہایت ہی عزیز تھے جن کو حضورؐ نے بچپن میں بالکل اپنے بچوّں کی طرح پالا پوسا تھا۔ جب یہ بچے تھے تو حضورؐ خود ہی محبّت سے ان کا ہاتھ منہ دھویا اور ناک صاف کیا کرتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ اگر اسامہ بیٹی ہوتا تو ہم اس کو اچھے اچھے کپڑے پہناتے۔ اگر اسامہ بیٹی ہوتا تو ہم اس کو عمدہ عمدہ زیور پہناتے۔ ان اسامہ نے فاطمہ بنت اسد کی سفارش کی کہ اس کو قطعِ ید کی سزا سے معاف رکھا جائے۔ اسامہ کی بات سُن کر چہرۂ اقدس غضب وجلال سے سُرخ ہوگیا اور آپ نے گرجدار آواز میں فرمایا کہ اے اسامہ تم حدود اللہ میں سفارش کرتے ہو! خدا کی قسم اگر محمدؐ کی بیٹی فاطمہ بھی چوری کرتی تو میں اس کا ہاتھ کاٹ ڈالنے سے باز نہ رہتا۔ پھر آپؐ نے فرمایا کہ تم سے پہلی قومیں اسی لئے تباہ ہوئیں کہ ان کا بڑا جب کوئی غلطی کرتا تھا تو نظر انداز کر دیا جاتا تھا اور اگر کسی چھوٹے سے کوئی خطا سرزد ہو جاتی تو فوراً دھر لیا جاتا تھا۔

ایک کامیاب سیاسی قائد اور مدبّر کے لئے بڑا خطیب اور مقرر ہونا بھی ہر زمانہ ہی

میں ضروری سمجھا جاتا رہا ہے۔ دُنیا میں جتنے بھی کامیاب سیاسی قائد گزرے ہیں وہ تقریباً سبھی قادرالبیان خطیب تھے۔ کیونکر ممکن تھا کہ عکاظ و ذوالمجاز کا مبلّغ، حدیبیہ کا مدّبر اور مدینہ کا سردار اخطب العرب بلکہ اخطب الناس نہ ہوتا۔ یوں تو اللہ تعالیٰ نے اپنے ہر نبی کو قوّتِ بیان اور طلاقت لسان عطا فرمائی ہے لیکن خاتم الرسل آخرالانبیاء پہ اللہ نے یہ صفت بھی ختم کردی تھی۔ خود آپؐ نے فرمایا أنا افصح العرب کہ میں عرب میں فصیح ترین شخص ہوں۔ عرب میں زبان و بیان کے اعتبار سے دو قبیلے زیادہ نمایاں تھے۔ قریش اور ہوازن۔ قریش کے تو آپ تھے ہی اور ہوازن میں آپؐ نے نہ صرف اپنا بچپن گزارا تھا بلکہ اس سے آپؐ کا رضاعی تعلّق بھی تھا۔ یہی وجہ ہے کہ حضورؐ کو بارہا فی البدیہہ خطبے دینے کا اتفاق ہوا لیکن جو خطبہ دیا وہ عربی زبان کے ادبیاتِ عالیہ کا اعلیٰ ترین نمونہ ہے۔

عموماً مسجد میں خطبہ دیتے وقت دست مُبارک میں عصا اور میدانِ جنگ وغیرہ میں خطبہ دیتے وقت کمان ہوتی تھی۔ عموماً کسی بلند جگہ مثلاً منبر، سواری یا کسی پہاڑی وغیرہ سے خطاب فرماتے تھے۔ خطبے عموماً مختصر اور جامع ہوتے تھے۔ جو بات بیان فرماتے نہایت توجہ، جوشِ بیان بالفاظِ دیگر خونِ جگر سے فرماتے تھے۔ خطبہ کے نقطۂ عروج کے وقت آواز بلند ہو جاتی تھی، چہرۂ مبارک غضب آلود معلوم ہوتا تھا۔ سُننے والے محسوس کرتے کہ گویا آپؐ کسی فوج کو جنگ کے لئے اُبھار رہے ہیں۔ جوشِ بیان میں جسد مُبارک اِدھر سے اُدھر جھُوم جاتا تھا۔ ایسے ہی ایک خطبہ کی حالت عبداللہ بن عمر نے یُوں بیان کی ہے: "ایک بار مَیں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کو منبر پر خطبہ دیتے سُنا آپؐ فرما رہے تھے کہ خُداوند صاحبِ جبروت آسمانوں اور زمینوں کو اپنے قبضۂ قدرت میں پکڑے گا یہ بیان کرتے ہوئے آپؐ نے اپنی مُٹھی بند کرلی پھر آپؐ نے اس کو کبھی کھول کے اور کبھی بند کرکے اشارہ کیا..... آپؐ کا بدن مُبارک دائیں سے بائیں جھُوم جھُوم جاتا تھا، یہاں تک کہ مَیں نے دیکھا کہ منبر کا نچلا حصّہ بھی اس قدر ہل رہا تھا کہ مجھے خیال ہُوا کہ منبر آپؐ کو لے کر گِر تو نہیں پڑے گا۔"

فنِ خطابت اور وجوہِ بلاغت کے نقطۂ نظر سے غور کیا جائے تو خطباتِ نبوی فنِ خطابت کا معیار ٹھہرتے ہیں، ایک ایک خطبہ کے معانی اور وجوہ بلاغت پر ایک ایک دفتر تیار ہو سکتا

ہے۔ اس کے علاوہ حضورؐ کے ہر خطبہ نے ٹھیک وہی اثر سُننے والوں پر مرتب کیا ہے جو حضورؐ مرتب کرنا چاہتے تھے۔ حضورؐ کے سیاسی نوعیت کے خطبوں میں فتحِ مکّہ کے موقع پر آپؐ کا خطبہ، غزوۂ حنین کے موقع پر وہ خطبہ جس میں آپؐ نے انصار سے خطاب فرمایا تھا، غزوہ بن المصطلق کے موقع کا وہ خطبہ جس میں مہاجرین و انصار کو باہمی اختلاف پر تنبیہ فرمائی تھی سیاسی تقریروں کی بہترین مثالیں ہیں۔ دینی اور مذہبی نوعیت کے خطبات کی اثر آفرینی کا تو کیا ہی کہنا ہے۔ ایک صحابی ایسے ہی ایک خطبہ کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے صبح کی نماز کے بعد ایک نہایت فصیح و بلیغ اور مؤثر تقریر فرمائی جس کو سُن کر سامعین کے دل کانپ اُٹھے اور آنکھوں سے اشکوں کے سیلِ رواں جاری ہو گئے۔ ایک اور موقع پر آپؐ نے اپنی تقریر میں عذابِ قبر اور امتحانِ قبر کا کچھ اس انداز سے ذکر فرمایا کہ لوگ دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے خطبات میں اہم ترین اور مشہور ترین حجۃ الوداع، تبوک، فتحِ مکّہ وغیرہ کے مواقع پر دیئے جانے والے خطبات ہیں۔ ان خطبات میں حضورؐ کی خطیبانہ شان ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔

خطابت کے ساتھ ساتھ بلکہ اس سے بھی بڑھ کر ایک کامیاب مدبّر کے لئے ضروری ہے کہ وہ سیاسی گفت و شنید میں بھی مہارتِ تامہ رکھتا ہو، اپنے نقطۂ نظر کی حقانیت و صداقت اور اپنے برسرِ حق ہونے کا نہ صرف اسے خود کامل یقین ہو بلکہ وہ اس کو اپنے دلائل کی قوّت سے مخالف سے منوا لینے کی بھی اہلیت و صلاحیت رکھتا ہو۔ اس کی بصیرت اس درجہ کی ہو کہ وہ بروقت یہ فیصلہ کر سکے کہ کس موقع پر کیا بات مخالف سے منوائی جا سکتی ہے اور کیا نہیں، کیا بات کسی خاص مرحلہ میں اہمیت رکھتی ہے اور یہ کہ بنیادی اصولوں پر کسی طرح کا کوئی لین دین نہ ہو۔ سیاسی گفت و شنید میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کی پیغمبرانہ بصیرت کی یوں تو ہزارہا مثالیں موجود ہیں لیکن شاید سب سے زیادہ نمایاں مثالیں دو ہیں :-

۱- میثاقِ مدینہ کے نفاذ کے بعد جب آپؐ نے نہایت مختلف النوع عناصر کو محض اپنے حسنِ تدبّر سے یکجا کر کے ایک سیاسی و حکومتی نظم کی بناء ڈال دی، ایک قطرۂ خون زمین

پروگرام بغیر ایک نظریاتی اور انقلابی حکومت کی اساس رکھ دی، اس کی مثال انسانی تاریخ سے پیش کرنا ممکن نہیں۔ ایک طرف مسلمانوں اور خاص طور پر مہاجرین کی بے سروسامانی کا خیال کیجئے، دوسری طرف یہودیوں کی کھلی اور چھپی عداوت کو ذہن میں رکھیے۔ اس کے بعد منافقین کی ریشہ دوانیاں نگاہ میں لائیے، پھر آخر میں قریشِ مکّہ کی مخالفانہ سفارتی کوششوں کو یاد کیجئے۔ ان سب موانع کے باوجود اتنا بڑا کارنامہ حضورؐ نے اتنی کم مدّت میں انجام دیا۔ اس قدر مختلف اور متضاد عناصر کو ایک لڑی میں پرو دیا، اور لطف یہ کہ اختیارِ برتر اور اقتدار فائق اللہ، اللہ کے رسول اور اللہ کے قانون کے قبضہ میں رہا۔ یہ سب حضور صلعم کی سیاسی بصیرت اور سفارتی تدبّر کا کمال نہیں تو اور کیا ہے۔ ابھی ماضی قریب میں بعض نظریاتی اور انقلابی حکومتیں دُنیا کے مختلف حصّوں میں قائم ہوئی ہیں۔ ان کے قائم کرنے والوں کو کیا کیا جتن کرنے پڑتے ہیں اور کتنے پاپڑ انھوں نے بیلے ہیں اور نسلِ انسانی کا لہو پانی کی طرح بلکہ اس سے بھی کہیں ارزاں سمجھ کر جو بہایا ہے وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں، اور جو کچھ خیر ان کے ہاتھوں نسل آدم تک پہنچا اس سے بھی نسل آدم ناواقف نہیں۔

۲۔ سیاسی گفت وشنید کی دوسری نمایاں مثال صلح حدیبیہ ہے جس میں حضورؐ نے محض اپنے تدبّر سے خود مخالفین کے کیمپ سے ان شرائط کا مطالبہ کرا لیا جو اپنے فوری اور دُوررس ہر دو قسم کے نتائج کے اعتبار سے سو فی صد اسلام اور مسلمانوں کے حق میں تھیں، جبکہ مشرکینِ مکّہ اور خود مسلمان ——— حتیٰ کہ حضرت عمرؓ جیسے بالغ النظر مدبّر ——— یہ سمجھ رہے تھے کہ یہ ساری شرائط مسلمانوں کے لئے نہایت توہین آمیز ہیں۔ لیکن معاہدے کی تکمیل کو چند لمحے بھی نہ گزرے تھے کہ اللہ ربّ العزّت کی طرف سے سورہ فتح کی صورت میں اس عظیم الشان کارنامہ پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کو پیامِ تہنیت بھیجا گیا جس میں اس معاہدہ کو فتحِ مبین اور نصرِ عزیز کے الفاظ سے یاد کیا گیا۔ چند مہینے بھی نہیں گزرے تھے کہ یہ فتحِ مبین کھل کر سامنے آگئی اور محمدی بصیرت پر ازلی و ابدی مہرِ تصدیق ثبت کر گئی۔

آخری چیز جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کو دوسرے تمام مدّبرین کے مقابلہ میں امتیاز اور ان پر فوقیّت بخشتی ہے وہ یہ ہے کہ دنیا کا کوئی بڑے سے بڑا قائد اور مدّبر بھی کبھی اس میں کامیاب نہیں ہو سکا کہ اپنی زندگی میں یا اپنے بعد ہی ایسے لوگ پیدا کر سکتا جو اس کے پیغام، اس کی فکر، اس کے فلسفہ، اس کے قائم کردہ نظام اور اس کے پیش کردہ طریق زندگی کی رُوح سے واقف ہوں، اُسی انداز سے اس کی اُٹھائی ہوئی تحریک کو لے کر آگے چل سکیں اور اس کی جانشینی کے جملہ تقاضے پورے کر سکیں۔ اس معاملہ میں اگر کسی کو بہت زیادہ کامیابی حاصل ہوئی ہے تو صرف اس قدر کہ اس کے مرنے کے بعد دو ایک آدمی ایسے کھڑے ہو گئے جنھوں نے جزوی طور پر اس کے شروع کئے ہوئے مشن کی کچھ خدمت کی اور پھر وہی قحط الرجال اور بے مردمی کا عالم۔ مہاتما بُدھ، کنفیوشس اور حضرت عیسیٰ مسیح سے لے کر موجودہ زمانے کے قائدین تک کون ہے جس نے اپنے جیسے جانشینوں کی ایک جماعت چھوڑی ہو جس نے اپنے قائد کے مشن کو کما حقہ' آگے بڑھایا ہو اور انہی خطوط پر تحریک کی رہنمائی کی ہو جو قائد تحریک کے پیش نظر تھے۔

دوسری طرف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کو دیکھئے اور آپؐ کے پاکباز ساتھیوں پر نظر ڈالئے ان میں سے ہر ایک بقول زبان وحی آسمان ہدایت کا نجم تاباں ہے۔ ان حضرات نے کہاں تک پیغام محمّدیؐ کی رُوح کا درک حاصل کیا اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ ماہرین حدیث نے تصریح کی ہے کہ صحابہ کا وہ گروہ جس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کے متعلق کوئی نہ کوئی حدیث مروی ہے ایک لاکھ سے زائد تعداد رکھتا ہے۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے ۲۳ سال کے عرصہ میں کیسے ساتھی تیار کئے تھے۔ یہ حضرت ابو بکرؓ کے عزم واستقلال، حضرت عمرؓ کے عدل وانصاف حضرت عثمانؓ کی حیاء اور حضرت علیؓ کی قضاء سے معلوم ہو گا۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے مشن کو اُن کے بعد کیسے لوگوں نے آگے بڑھایا۔ یہ اللہ کی تلوار حضرت خالدؓ بن ولید کی شجاعت عمرو بن العاص کی سیاست، فاتح ایران سعد بن وقاص کی عسکری قیادت سے پتہ چلے گا۔ پیغام محمدی کی رُوح کو سمجھنے والے کیسے تھے،

یہ ہم کو عائشہ اور ابو ہریرہ کے درسِ حدیث، ابو دردا، اور زید بن ثابت کے درسِ قرآن، عبداللہ بن عباس کے درسِ تفسیر اور عبداللہ بن عمر اور عبداللہ بن مسعود کے درسِ فقہ میں معلوم ہوگا۔ الغرض محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم اور ان کے ساتھیوں کی کس کس صفت کا ذکر کیا جائے۔

ز فرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم
کرشمۂ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجا ست